کیا ادب کو مذہب سے دُور رکھنا چاہیئے؟

عالمی شہ پاروں کا تنقیدی مطالعہ

(سیّد حبیب الحق ندوی)

مواد و ہیئت (MATTER AND FORM) ادب کی اساس ہیں لیکن جو مسئلہ ہنوز ادب کا نزاعی مسئلہ ہے وہ یہ ہے کہ آیا مواد میں عقائد (BELIEFS) کی آمیزش جائز ہے یا ناجائز؟ فن برائے فن کے طرف دار عقائد کی آمیزش کے منکر ہیں۔ ان کے خیال میں ادب ادب ہے، فلسفہ، دینیات، سیاسیات و معاشیات کا پروپیگنڈہ نہیں۔ تخلیقی ادب میں واردات قلب کوائف نفس اور جمالیاتی شعور کے سوا کچھ اور پیش کرنا ان کے نزدیک بے ادبی ہی نہیں بلکہ انشائی شعور (CREATIVE SENSE) کے منافی بھی ہے۔

ممکن ہے تنقیدی مباحث کی حد تک یہ نظریات درست ہوں لیکن تخلیقی تجربہ اس کے خلاف ہے۔ ادب، نظم ہو یا نثر، شاعر کی شخصیت اور اس کے عقائد کی جھلک سے مبرّا نہیں ہو سکتا۔ درحقیقت شخصیّت ایک وسیع لفظ ہے۔ جمالیاتی شعور ہو یا دینی عقائد، سیاسی و سماجی نظریات ہوں یا معاشی طرز فکر سب شخصیت کا جزو لاینفک ہیں اور وہ انشائی ذات (CREATIVE - SELF) کا حصّہ ہیں۔ ہر عقیدہ خواہ دینی ہو یا غیر دینی، سیاسی ہو یا غیر سیاسی، فنکار کے عقائد کا جزو ہے اور یہی مختلف عقائد اس کی شخصیت کے اجزاء ترکیبی ہیں۔

کسی ایک ملک و قوم کا ادب نہیں عالمی فن پارے اس نظریے کی تائید کرتے ہیں۔ مغرب کا ادب یا مشرق کا۔ نظم ہو یا نثر، غزل ہو یا مرثیہ، مدح ہو یا ہجو، رزمیہ ہو یا بزمیہ، طربیہ ہو یا المیہ، ہر صنف ادب فن کار کے عقائد سے متاثر ہوتی ہے۔ کسی دَور کا ادب محض فنی محاسن اور صنائع و کی بنا پر مقبول نہیں ہوتا۔ اس کی مقبولیت میں ان عقائد کا بھی دخل ہوتا ہے جو اس دَور سے تعلق

وم خداؤں کے ذریعہ وجود میں آیا۔ اس لئے عوام کا فریضہ ہے کہ وہ خدائی مشن کی حفاظت
ہیں روم کی تاریخ ورجل یوں بیان کرتا ہے کہ تاجدار روم اگسٹس کے اسلاف قدسی (جو انیاز
ی اولاد میں تھے) نے اس کی بنیاد رکھی۔ زوال ٹرائے کے بعد انیاز خدائی ابہام پر اپنے رفقاء اور
لولے کر مغرب کی جانب ارض موعودہ (PROMISED LAND) کی تلاش میں نکل پڑا۔
حل سفر پیش آئے۔ ہمت ہار کر وہ اور اس کے رفقاء نے دوران سفر میں کہیں متوطن ہونے کا
کارتھیج (CARTHAGE) میں ڈیڈو (DIDO) کے ساتھ رہنے کا ارادہ کیا۔ لیکن خداؤں کی
ائی اور الہام پر وہ آگے چل پڑا اور بالآخر اٹلی پہنچا۔ ہاڈس (HADES) سے ملا۔ جس نے
لاد کے تابناک مستقبل کی پیش گوئی کی۔ وہ تیبر (TIBER) پہنچا اور مقدس شہر روما کی بنیاد
سعادت اس کی تقدیر کا نوشتہ تھا۔ خدا اس کے ساتھ تھے۔ اسی لئے روما پھلا پھولا اور عالمگیر
دعزت کا مالک بن گیا۔ اس شہر کے باشندے اور نئے آنے والے جونو (JUNO) کے حکم سے
(LATINS) کے نام سے موسوم کئے گئے۔

چونکہ انیاز خدا کا فرستادہ تھا اور اگسٹس اسی خاندان کا ایک فرد تھا۔ لہذا فرمانروائے روم کا
ماکہ وہ روما کی تقدیر کو اجاگر کرے اور موجودہ بدحالی دور کرے ورنہ خداؤں کی ناراضی اس کی تباہی
ب بنے گی۔ دراصل ورجل کا دور سیاسی بحران اور اخلاقی زوال کا دور تھا۔ انتونی اور قلوپطرہ کے
سے تا زمانہ حال کوئی سو سال سے روم خونیں خانہ جنگیوں کا شکار تھا۔ قیام امن کی شدید ضرورت تھی
اقت ور بادشاہ ہی اس انتشار کو دور کر سکتا تھا۔ سیاسی امن اور اخلاقی احیاء کے لئے خدا نے
ن کو بھیجا تاکہ عہد آفرین اصلاحات کا آغاز ہو۔ یہ فریضہ تاجدار روما کے ذمہ خداؤں کی طرف سے
DIVINELY ORDAIN سپرد کیا گیا۔

ورجل خود وثنی تھا۔ سارا روم وثنی تھا۔ لہذا دیوی اور دیوتاؤں کے بغیر عصری عقائد کی
اسی ناممکن تھی۔ ہومر کا خدائے برتر زیس (ZEUS) تھا لیکن ورجل کا برتر خدا جیپٹر
(JUPITE) تھا۔ لیکن وہ زیس (ZEUS) کی طرح کمزور نہیں تھا بلکہ طاقت ور تھا اور اولمپیا
(OLYPIAN) کے تمام دوسرے خدا اس کے تابع تھے۔ وہ اس کی مرضی اور حکم کے بغیر کچھ نہیں
سکتے تھے۔

ورجل کے مواد میں زیادہ ندرت نہیں۔ وہی یونانی مواد اور واقعات سفر ہیں۔ ہومر سے وہ ساخت میں کچھ مختلف ضرور ہے۔ ورجل کی رزمیہ نظم (EPIC) بیان، طرز ادا، تخیل اور جذباتی اثریت میں غزل (LYRICS) سے زیادہ قریب ہے۔ لیکن بنیادی طور پر ہومر اور ورجل دونوں کا مقصود قومی افتخار، شجاعت کے قصے وثنی عقائد کی آمیزش کے ساتھ بیان کرنا تھا۔

ملٹن کی فردوس گم گشتہ

دانتے اور ملٹن وثنی ہومر اور ورجل سے مختلف ہیں۔ یہ دونوں عیسائی مذہب کے نقیب ہیں۔ ایک خالص کیتھولک نظریات کا ترجمان ہے دوسرا پیورٹن (PURITAN) عقائد کا مبلغ۔ ۱۶۶۷ء میں ملٹن نے فردوس گم گشتہ (PARADISE LOST) لکھی۔ یہ شاہکار (MASTERPIECE) ہومر اور ورجل کے فن پاروں کا مدمقابل تصور کیا جاتا ہے۔ عقائد و نظریات میں نہیں۔ فنی پیش کش اور تخلیقی اپج میں۔ ملٹن کی ذات محتاج تعارف نہیں۔ وہ خالص پیورٹن (PURITAN) عقائد کا حامی تھا۔ چرچ کی اصلاح اور مروجہ مذہب کے بے جان مناسک کے خاتمہ کے لئے پیورٹن تحریک کا آغاز ملکہ انگلستان الزبتھ کے دور میں ہوا۔ یہ تحریک پیورٹن انقلاب (PURITAN REVALUTION) کے نام سے معروف ہے۔ اسی تحریک نے تاجِ برطانیہ کو ہلا دیا۔ حکومت پر قبضہ کر لیا۔ لیکن کامیابی کے بعد زعمائے انقلاب میں نااتفاقی ہو گئی۔ برسر اقتدار پیورٹن حکومت کا خاتمہ ہو گیا اور شاہی خاندان اسٹوارٹ تاج انگلستان پر دوبارہ قابض ہو گئے۔ جسے تاریخ میں عود شاہی ۱۶۶۰ء (RESTORATION 1660) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ پیورٹن تحریک کا اصل منشور مذہبی حکومت (THEOCRACY) کا قیام اور خالص مذہبی بنیادوں پہ بائبل کی روشنی میں سماجی زندگی کا احیاء تھا۔ لیکن سترھویں صدی تک یہ تحریک ختم ہو گئی۔ ملٹن خالص پیورٹن عقائد کا حامی تھا۔ مذہبی زندگی کو برپا کرنے اور بائبل کے قوانین و احکامات کے احیاء کا آرزومند تھا۔ عرصہ سے اس کی تمنا تھی کہ وہ قومی رزم لکھے جو پیورٹن تحریک کی کامیابی کا ترانہ ہو لیکن تحریک کی ناکامی کے بعد ملٹن کے جذبات سرد ہو گئے۔ شاہی حکومت کی بحالی کے بعد ملٹن پہ سخت جرمانے لگائے گئے۔ اس سیاسی انتقام سے آزردہ خاطر اور مایوس ہو کر وہ ہمیشہ کے لئے گوشہ نشین ہو گیا۔ بائبل اس کی

ءِ آغاز اور منتہائے پرواز ہوگئی۔ اس المناک گوشہ نشینی میں اس نے تین عظیم مذہبی

ہیں، جو مواد کے اعتبار سے خالص دینی (POEMS OF RELIGIOUS IMAGINATION)

ردوس گم گشتہ (۲) فردوس بازیافتہ (۳) سیمسن اگونسٹز (SAMSON AGONISTES)

تے کو مغربی ادب کا عروج تصور کیا جاتا ہے۔ یہ تخلیقات ادبی، فنی اور جمالیاتی عروج کے

مذہبی عقائد کا بھی عروج ہیں۔

ٹن ۴۴ سال کی عمر سے قبل یعنی ۱۶۵۲ تک مکمل نابینا ہو چکا تھا۔ بینائی کھونے کے بعد فکرو

طاقت اور دینی بصیرت میں روز افزوں اضافہ ہوا۔ وہ نظام الہائیات پر تامل کرنے کا

وگیا۔ اسی لئے آدمؑ، عیسٰیؑ اور سیمسن اس کے فن پاروں کا موضوع ہیں۔

ردوس گم گشتہ (۱۶۶۷ء) درحقیقت سقوط آدمؑ کی داستان ایک رزمیہ نظم (EPIC OF

THE FALL OF) ہے، عیسٰیؑ کے ابن اللہ ہونے کا اقرار نامہ ہے۔ ملٹن عیسائی عقیدۂ

ابنِ انسان کو پیدائشی عاصی تصور کرتا ہے۔ یہ گناہِ آدم یا نافرمانی آدم کی سزا ہے، جو ہر ابن آدم

دن پر ہے۔ عیسٰیؑ خدا کے بیٹے نے اپنی قربانی کے ذریعہ اس نافرمانی کا کفارہ ادا کیا۔ لہذا بنی آدم کا

اسی وقت دُھل سکتا ہے جب وہ عیسٰیؑ کو ابن اللہ تسلیم کریں۔ اس عقیدہ کے منکرین عاصی ہیں

ہنمی بھی۔ ان کی نجات (SALVATION) ممکن نہیں۔ اسی قربانی کی بدولت عیسٰیؑ بنی آدم کے نجات

ندہ (SAVIOUR) کہے جاتے ہیں۔ ہیئت میں ملٹن نے بعض تبدیلیوں کے ساتھ ورجل کی

ی کی ہے۔

فردوس گم گشتہ کا مواد بائبل، تالمودی روایات اور عیسائی چرچ کی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔

م کی ہیئت و تکنیک میں ملٹن نے ورجل و ہومر کی پیروی کے ساتھ عام رزمیہ روایات کی

بندی بھی کی ہے۔ مثلاً ملٹن افتتاحی اشعار میں ہی غرض تصنیف، موضوع تصنیف کی وضاحت

رتا ہے۔ الہامی دیوی (MUSE OF INSPIRATION) سے استدعا کرتا ہے۔ وسط

وادث سے کہانی کا آغاز کرتا ہے۔ ہیرو کے اعداد و شمار پیش کرتا ہے۔ یہ سب رزمیہ نظم کی قدیم

وایات (CONVENTIONS OF EPIC) تھیں جن کا ملٹن نے پابندی کے ساتھ التزام کیا

ہے۔ البتہ اس کی نظم معرّا (بلنک ورس) ہے۔

ابتدائی ابواب میں شیطان فعال ہے، متحرک ہے۔ پیکر عزم آہنیں ہے۔ غرور و تکبر کا مجسمہ ہے، اعتراف جرم و شکست اس کی فطرت کے خلاف ہے لیکن جوں جوں غرور و نخوت کی کمزوریاں ظاہر ہوتی جاتی ہیں۔ شیطان کا کردار کمزور ہوتا جاتا ہے اور آدمؑ کا کردار جرم کے باوجود اعتراف جرم کی بنا پر بلند و برتر ہوتا جاتا ہے۔ اس کے بعد آدم من حیث کردار ابھرتا ہے۔ اور شیطان ڈوبتا ہے۔ نظم میں شعری تنوع، المیہ نگاری، بیانیہ اسلوب، لطافت و ذہانت کی آمیزش ہے۔ البتہ سماوی مناظر کچھ کمزور اور غیر حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ نیز خدا کی گفتگو یا مکالمہ میں غیر ضروری افسردگی ہے۔ ان تمام محاسن و مصائب کے باوجود فردوس گم گشتہ ایک ادبی شاہکار ہے۔ کیا اس کی مقبولیت میں ان عقائد کو دخل نہیں جو فن پارہ کی اساس ہیں۔

فردوس بازیافتہ (PARADISE REGAINED)

۶۵-۱۶۶۷ء کے درمیان فردوس بازیافتہ منظر عام پر آئی۔ اس میں ملٹن نے عیسائی عقیدہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے۔ وہ دکھلانے کی سعی کرتا ہے کہ جو جنت آدمؑ کے ہاتھوں گم ہوئی، عیسیٰؑ کے ہاتھوں کس طرح واپس مل گئی۔ آدمؑ شیطان کے مطیع ہو گئے اور عیسیٰؑ نے شیطان کی تمام ترغیبات (عیسیٰؑ کو چار طرح کے لالچ شیطان نے دیئے جو بائبل میں TEMPTATIONS کے زیر عنوان مذکور ہیں۔) کو ٹھکرا دیا۔ اس نظم میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے بعض واقعات بائبل کی روشنی میں دکھائے گئے ہیں۔ جان (JOHN) کے ہاتھوں عیسیٰؑ دریائے اردن (اس دریا کی نسبت سے میں بہ منعدد کتابیں لکھی گئی ہیں — نہ صرف سرزمین اردن عیسائیت کی مقدس سرزمین ہے بلکہ اس کا ہر ذرّہ اور قطرہ دلوتا ہے) میں طاہر و مطہر (BAPTISED) کئے گئے۔ اس طہارت کے بعد کے واقعات اس میں درج ہیں۔

فردوس بازیافتہ ۴ ابواب پر مشتمل ہے۔ جس میں شیطانی وساوس، تملق و لالچ اور عیسیٰؑ کے افکار اور عزم مصمم کی روایات بائبل کی زبانی پیش کی گئی ہیں۔

عیسیٰؑ آزمائشوں کے بعد ایمان میں پختہ نکلے اور فرشتوں نے آکر انھیں نبوت کا مژدہ سنایا ملٹن نے اس نظم میں ہیرو کی خود آگہی (SELF - AWARENESS) کو دکھانے اور ابھارنے کی

م نافرمان نکلے لیکن عیسیٰؑ خدا کا بیٹا باپ کا مطیع نکلا۔
ہیں ڈرامائی عناصر بہت کم ہیں۔ ورڈس ورتھ انگریزی شاعری کی یہ پسندیدہ نظم
ور پیش کش میں یہ نظم بلاشبہ فردوس گم گشتہ سے کمزور اور فروتر ہے۔ کیا یہ
عائد کی اشاعت سے مبرّا ہے؟
ی تیسری معروف مذہبی نظم سیمسن اگونسٹز (SAMSON AGONISTES) ہے۔ اس
صیغ کی گئی ہے۔ یونان کے المیہ اسلوب کی پیروی کی ہے۔ معروف ڈرامہ نگار سوفوکلز
(S) کا طرز اختیار کیا ہے۔ عبرانی ہیرو سیمسن کی زندگی کے آخری دن کا واقعہ نقل کرتے
ہے کہ نابینا سیمسن ارض فلسطین کے اصلی باشندوں (PHILISTINES) کے ہاتھوں
ہ (GAZA) میں جبریہ محنت کا شکار ہے۔ اس کی بیوی بدقسمتی سے فلسطینی ہے جو
فا ہے۔ تقدیر کے ہاتھوں سیمسن مبتلائے عذاب ہے۔ آخر قومی جشن اور عید کے دن
ہوا کہ وہ نوابوں اور امراء کی محفل میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرے۔ سمسن نے انکار کیا۔
ے حکم پر اس نے اسمبلی کے ستونوں کو گرا کر خود اپنی جان دے دی اور حاضرین کی
س طرح موت کے بعد مظلوم سیمسن خدا سے جاملا۔ یہ واقعہ بک آف ججز
(BOOK OF JUDG) سے ماخوذ ہے۔
بقت ملٹن نے اس میں اپنی کہانی سیمسن کی زبانی بیان کی ہے۔
ن زندہ حقائق کی روشنی میں کوئی ادبی ناقد یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ فن کے حریم ناز میں
خل ہونے کا حق نہیں۔

دانتے کی کامیڈی

واد میں عقائد کی آمیزش کا ثبوت مندرجہ بالا عالمی فن پاروں کے مطالعہ سے واضح ہے
درحقیقت مستثنیات میں سے ہے، جو ہیئت (FORMS) تک میں عقائد کی آمیزش
ہومر کی رزمیہ ہکسامیٹر (HEXAMETER) میں لکھی گئی ہے۔ ورجل نے اسی کی پیروی
آزاد نظم کو ترجیح دی۔ لیکن دانتے نے اپنے کامیڈی (طربیہ) کی تصنیف کے لئے نادرو
یت ٹرزاریما (TER ZARIMA) یعنی تثلیث قوافی کی ایجاد کی۔ دانتے نے اشعار کی
ابواب میں ہر جگہ عقیدہ تثلیث کو زندہ رکھنے کے لئے تین اور نو وغیرہ کا توازن رکھا ہے۔

اس کے اشعار مثلث بند ہیں۔ جو عروج فن کے ساتھ مذہبی توغل کا بھی عروج ہیں۔

دانتے نے اپنے لازوال فن پارے کا نام کامیڈی رکھا۔ بعد کی نسل نے اس میں THE DIVINE کا اضافہ اس لئے کیا کہ یہ مافوق الفطرت شاعری تھی اور اس میں آسمان، ارواح، قدسیات عالم بالا اور غیر مرئیات کے تذکرے تھے۔ یہ اطالوی زبان میں پہلا عظیم شاہکار تھا جس کے سہارے زبان عہد طفولیت سے اچانک سن بلوغ کو پہنچ گئی۔

دانتے کی کامیڈی مغربی ادب میں بے پایاں اہمیت کی مالک ہے۔ کیونکہ وہ اپنے نظریہ گناہ (SINS) اور محاسن (VIRTUES) کی عکاسی تلمیحی (ALLEGORICAL) اور تمثیلی (ANALOGICAL) طرز سے کرنے میں غیر معمولی طور پر کامیاب ہوا۔ روح انسانی کی نجات کے مختلف مدارج کی منظر کشی بھی کامیاب ہے۔ جدید ناقدین میں ٹی ایس الیٹ (T-S.ELIOT) دانتے کی شاعری کو اس لئے مابعدالطبعیاتی شاعری (METAPHYSICAL POETRY) قرار دیتا ہے کہ نظم کے ڈرامائی اور غزلی عناصر مذہبی اور تبلیغی عناصر پر غالب ہیں (ملاحظہ ہو الیٹ کا عالمانہ مقالہ زیر عنوان "دانتے" مجموعہ مضامین، نیویارک ۱۹۳۲ء، ص ۲۰۴)

راقم الحروف کو الیٹ کی رائے سے اختلاف ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہبی اور تبلیغی عناصر ڈرامائی اور غزلی عناصر پر غالب ہیں۔ اس لئے اس شاعری کو کیتھولک مذہب کا صحیفہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ڈرامائی اور غزلی عناصر سب کیتھولک عقیدہ کی کامیاب ترجمانی کے لئے استعمال کئے گئے ہیں۔

دانتے، وثنی ورجل (جسے دانتے اپنا استاد و رہبر تسلیم کرتا ہے) کے ساتھ جہنم کی سیر کرتا ہے۔ جہنم میں مجرمین کے خلاف نفرت بھڑکتی ہے۔ ساتھ ہی ہمدردی کا جذبہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ اعراف میں دانتے متحرک و فعال نظر آتا ہے۔ کیونکہ اعراف درحقیقت مادی دنیا کے حالات سے قریب تر ہے جہاں توبہ اور امید کی ملی جلی فضاء موجود ہے۔ جہنم کے سفر میں دانتے شدت خوف سے کملایا ہوا نظر آتا ہے۔ جنت یا عالم بالا اور عالم نور کی سیاحت میں جہاں اس کی محبوبہ بیٹرس راہبر ہے۔ دانتے خدا کی ذات میں تحلیل ہو جانے کا آرزومند نظر آتا ہے کیونکہ تثلیث کا فلسفہ حلول کی تائید میں ہے۔ سفر کے آخری مراحل میں دانتے اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ ایمان کو منطق سے تعلق نہیں۔ ایمان کے سامنے قیل و قال کی گنجائش نہیں ہوتی۔

جنت میں فن کار ادب کے ذریعہ چرچ اور ریاست کی فطرت کی توضیح کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ

ر ریاست دونوں من جانب اللہ ایک مشن کے حامل ہیں۔ اور ریاست و چرچ کی موجودہ
نہ صرف غیر فطری بلکہ منشاء الہی کے بھی خلاف ہے۔ پھر وہ امید و رجائیت کا اظہار کرتے ہوئے
کہ ریاست اور چرچ کے درمیان مفاہمت ناگزیر ہے کیونکہ یہ نوشتہ تقدیر ہے۔ پوپ جب
کے ماتحت اور پوپ و شہنشاہ دونوں جب خدا کے ماتحت ہوں گے تو عیسیٰ کا مشن پورا ہوگا۔
کامیڈی کا آخری باب مغربی ادب کا نقطہ عروج (SUMMIT) تصوّر کیا جاتا ہے۔ اس میں
ں روحانی خلش کا بھی عروج ہے۔ چاسر کے خیال میں یہ حصّہ قطعی الہامی ہے۔ ایسا الہامی ادب
کسی دَور میں کسی شاعر نے پیش کیا ہو۔

دانتے عہد وسطیٰ کے بدحال یورپ کا مسیحا تصور کیا جاتا ہے۔ وہ اعتدال پسندی کا علمبردار کہا
۔ عیسائیت کی زبوں حالی، چرچ اور پوپ کی روایت پرستی، سیاسی بحران، اخلاقی انحطاط نے
گھن کی طرح کھوکھلا کر دیا تھا۔ دانتے ان حالات سے غیر مطمئن تھا۔ وہ خالص کیتھولک دین
اء کا آرزومند تھا جس میں اس کے نزدیک یورپ کی نجات تھی۔ اسی لئے وہ اپنی کامیڈی میں
رج قائم کرتا ہے۔ جہنم، اعراف اور جنت۔ جہنم میں وہ ان تمام مجرمین کو گناتا ہے اور ان کی
کا تذکرہ کرتا ہے جو حضرت عیسیٰ پر ایمان نہیں لائے، نیز وہ جو ایمان تو لائے لیکن خالص کیتھولک
کے مطابق زندگی گزارنے سے قاصر رہے۔ اعراف کے دوسرے درجہ میں وہ امید و بیم کی فضاء
کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ نجات کی صورت ہنوز اسی میں ہے کہ لوگ خالص عیسائی
قبول کرلیں۔ جنت اور عالم بالا نور اور تثلیث کی دنیا ہے جہاں دیدار تثلیث کے بعد انسان کا
مل ہوجاتا ہے۔

ومر، ورجل، ملٹن اور دانتے مغرب کے ادبی خدا ہیں اور ان کی تخلیقات کو دنیائے ادب میں جو مقام
ہے محتاج بیان نہیں۔ گزشتہ صفحات میں ان کا سرسری جائزہ یہ سمجھنے کے لئے کافی ہے کہ ان فن کاروں
مذہبی عقائد اور وقت کے عام دینی رجحانات کو کس طرح ادب میں سمونے کی کوشش کی ہے۔ اس
ں ہم اپنی تصویر دیکھتے ہیں تو عجیب صورت حال سامنے آتی ہے۔ ہمارے ہاں اگر کوئی ادیب یا
سلام کا نام لے لیتا ہے تو اسے تمسخر و استہزا کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ اہل مغرب علم الاصنام کی خرافات
ن سماوی کی مسخ شدہ تعلیمات کو جزو ادب بنا کر پیش کریں تو وہ ہنر ٹھہرتا ہے اور مسلمان دین اسلام
آفاقی اور ابدی قدروں کو اپنے ادب میں جگہ دیں تو خود اپنوں ہی کی نظر میں مجرم قرار پائیں ☆

عربی زبان کی اہمیّت

(۳)

ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ
سابق پروفیسر عربی، پنجاب یونیورسٹی

عربی زبان سامی لسانیات کا سنگِ بنیاد ہے

علماء لسانیات نے دنیا کی زبانوں کو ان کی خصوصیات کی بناء پر متعدد خاندانوں یا زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں ایک خاندان آریائی زبانوں کا ہے، جن کو ہند یورپی (INDO - EUROPEAN) زبانیں بھی کہتے ہیں۔ ان میں سنسکرت، فارسی، یونانی، لاطینی، انگریزی وغیرہ زبانیں شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر زبانوں کا ادبی سرمایہ بہت وسیع و وقیع ہے۔ اس لئے اس خاندان کو علم اللسان اور ادبیات دونوں لحاظ سے بڑی اہمیّت حاصل ہے۔

دوسرا خاندان سامی زبانوں کا ہے، جس میں عربی، عبرانی، آرامی، کنعانی، حبشی اور بابلی زبانیں شامل ہیں۔ ان میں سے اکثر زبانیں متروک ہو چکی ہیں، صرف عربی اور حبشی ابھی تک زندہ ہیں۔ سامی زبانوں کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ تورات کی کتاب پیدائش کے مطابق جو قومیں اِن زبانوں کو بولتی تھیں، وہ بیشتر سام بن نوح کی اولاد سے تھیں، اس لئے ان کی زبانیں سامی کہلائیں۔ سامی زبانوں ——— (SEMITIC LANGUAGES) کی چند مشترک خصوصیات ہیں۔ جو اُن کے لئے وجہ امتیاز ہیں۔ سامی زبانوں کا ایک بڑا خاصہ یہ ہے کہ ان کے اکثر الفاظ سہ حرفی مادوں سے مشتق ہیں اور وہ مادے بیشتر حروفِ صحیحہ پر مشتمل ہیں، اگرچہ بعض میں حروفِ علّت بھی داخل ہیں۔ ان زبانوں کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اگر نئے الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آئے، تو یہ ضرورت اشتقاق کے عمل سے پوری کی جاتی ہے یعنی کسی مادہ (ROOT) سے اشتقاق کے ذریعے نئے الفاظ وضع کر لئے

۔ مثلاً جب اورینٹلسٹ (ORIENTALIST) کے لئے ایک مناسب عربی لفظ کی تلاش
شرق" سے "مستشرق" کا نیا لفظ بنا لیا گیا، جو عربی زبان میں پہلے موجود نہ تھا۔
ی زبانوں کا ایک اور خاصہ یہ ہے کہ نئے صیغے بنانے میں حرکات کی تبدیلی سے بہت
یا جاتا ہے۔ مثلاً اگر کسی اسم کا جمع کا صیغہ بنانا مقصود ہو تو یہ مقصد اس کی حرکات کو بدل
، ہو سکتا ہے۔ مثلاً اَسَد سے اُسُد اور کِتٰب سے کُتُب۔ یہی قاعدہ افعال میں بھی جاری ہے،
ی معروف فعل کو مجہول بنانا مطلوب ہو تو اس غرض کے لئے اس کی حرکات کو بدلنا کافی ہے۔
رَب سے ضُرِبَ، یَضرِبُ سے یُضْرَبُ۔ علاوہ ازیں مختلف ابنیہ کے ساتھ خاص خاص
وابستہ ہیں، مثلاً فاعِل، فعِیل، فعّال، مَفعَل، فُعال اور فُعالہ خاص خاص معنے رکھتے
ں کے علاوہ سامی زبانوں کے کچھ اور خصائص بھی ہیں، لیکن ہمیں سردست سامی زبانوں کی امتیازی
یات سے بحث کرنا مقصود نہیں بلکہ صرف اس امر کی وضاحت مطلوب ہے کہ اسی قسم کی مشترک
یات کی وجہ سے عربی زبان کے مطالعہ سے دیگر سامی زبانوں کی ساخت اور ان کی پیچیدگیوں
یں بڑی مدد ملتی ہے۔ اور اس لحاظ سے عربی گویا سامی لسانیات کا سنگِ بنیاد ہے۔

یہ بات اغلب ہے کہ سامی قوموں کا اصلی وطن عرب ہی کا خطّہ تھا اور سامی قومیں اسی ملک
ڑ کر وقتاً فوقتاً بابل، الجزیرہ، شام، فلسطین، مصر اور حبشہ کی سمتوں میں جاکر آباد ہو گئی
۔ عرب ہی وہ مرکزی مقام ہے جس کی زبان سے دوسرے ملکوں کی سامی زبانیں پیدا ہوئیں،
ام سامی زبانوں کی اصل عربی زبان ہی قرار پاتی ہے۔ عربی زبان میں ایسی دُور رس تبدیلیاں
ہوئیں، جیسی اشوری یا عبرانی زبان میں رونما ہوئی ہیں۔ اشوری (ASSYRIAN) اور
(HEBREW) قوموں کو غیر اقوام اور ان کے تمدن سے واسطہ پڑا تھا، اس لئے ان کا
ں عناصر سے متاثّر ہونا لازمی امر تھا۔ لیکن اس کے برعکس عرب کا ملک کچھ اس طرح الگ تھلگ
ہوا ہے کہ اس کی زبان بہت حد تک غیر سامی اثرات سے بچی رہی ہے، اس کے علاوہ اجنبی
ں کے باشندوں کی بھی وہاں تک رسائی نہیں ہوئی، اس لئے عربوں کی زبان میں نہ تو تیزی
اتھ تبدیلیاں ہوئی ہیں اور نہ ہی اس کی قدیم صورت بدلی ہے، لہذا عربی زبان کو سامی لسانیات
سِ بنیاد تسلیم کرنا کسی طرح بیجا نہیں ہے۔

مذکورہ بالا امور کے علاوہ دیگر سامی زبانوں کے مقابلہ میں عربی کا ذخیرۂ الفاظ نہایت وافر اور وسیع ہے اور اسلامی دور کے علماء لغت نے اس تمام ذخیرہ کو اس جامعیت اور تفصیل کے ساتھ مدوّن کر دیا ہے۔ اور اس کی ایسی وضاحت کے ساتھ تشریح کر دی ہے جو اور کسی سامی زبان کو قطعاً نصیب نہیں ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے زمانہ میں پرانی سامی زبانوں کے شاذونادر الفاظ کو سمجھنے کے لئے ہمیشہ عربی لغت ہی کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ یہی وہ اسباب ہیں، جنہوں نے عربی کو سامی زبانوں اور ان کے قواعد کو سمجھنے کے لئے ایک بنیادی اہمیت دے رکھی ہے۔

تورات کے مطالعہ میں عربی کی افادیت

عربی زبان اور عربی تمدن کے جاننے سے تورات کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔ اس نظریہ کے پیش کرنے میں ولندیزی مستشرق شول ٹنس (SCHULTENS) متوفی ۱۷۵۰ء کو سبقت حاصل ہے، چنانچہ اس نے ایک خاص مقالہ اس موضوع پر لکھا تھا اور اس ضمن میں سامی زبانوں کے تقابلی مطالعہ کی اہمیت پر بھی زور دیا تھا۔ اور اس نے "سفر ایوب" کی تفسیر لکھ کر اس اصول کی وضاحت کی تھی کہ عبرانی لٹریچر کی تشریح میں عربی محاورات اور طرزِ خیال سے بہت مدد مل سکتی ہے۔ عبرانی قوم بھی سامی نسل کی ایک شاخ تھی، جو حضرت مسیحؑ سے کئی سو سال پہلے شمالی عرب کے صحراؤں سے نکل کر فلسطین میں جا بسی تھی اور وہاں بھی ایک طویل عرصہ تک اپنی قدیم روش پر راعیانہ زندگی بسر کرتی رہی۔ لہذا ہم فطری طور پر اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ جو کچھ عربوں کی زندگی اور ان کے اطوار کے بارے میں کہا جا سکتا ہے، وہ عبرانیوں کی ابتدائی زندگی اور ان کے افکار پر بھی منطبق ہو سکتا ہے۔ اسی لئے تورات کی تفسیر میں عربی کے علماء کا اثر نہایت واضح نظر آتا ہے۔ چنانچہ پوکاک (POCOCKE) اور رابرٹسن سمتھ (ROBERTSON SMITH) نے انگلستان میں ویلہاذن (WELLHAUSEN) نے جرمنی میں تورات کی تفسیر عربی نقطہ نظر سے کی ہے۔ یعنی عربی زبان اور عربی اسلوب بیان ہی سے مدد لی ہے۔

اسی مسئلہ پر گفتگو کرتے ہوئے پروفیسر ویلہاذن، متوفی ۱۹۱۸ء، رقمطراز ہیں کہ "میں نے اپنی تحقیقات کا رخ عہد نامہ قدیم (یعنی تورات) سے عربوں کی طرف اس مقصد سے پھیرا ہے کہ میں اس نخلِ صحرائی (یعنی قوم عرب) کی حقیقت کو سمجھنا چاہتا ہوں، جس پر بنی اسرائیل کے انبیاء

علماء نے اپنی شاخ یعنی تورات کا پیوند لگایا تھا، کیونکہ مجھے اس بات میں کچھ بھی شک وشبہ نہیں
(عبرانی لوگ جس بضاعت اور استعداد کے ساتھ تاریخ کے منظر پر نمودار ہوئے تھے، اس بضاعت
ہی مجموعہ خصال) کا صحیح تصوّر اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے جب عبرانیوں کا مقابلہ
ب العاربہ (ٹھیٹ عرب) سے کیا جائے۔ اس مرحلہ پر یقیناً اس خالص عروبہ کا سوال پیش آتا
ہے، جیسی کہ وہ اسلام سے پہلے تھی، لیکن اس عروبہ کا سمجھنا کچھ آسان کام نہیں ہے۔"[1]

اسی طرح پروفیسر الفرڈ گیوّم (GUILLAUME) لکھتے ہیں کہ" انیسویں صدی کے اوائل ہی سے
اہلِ علم کا یہ دستور رہا ہے کہ عبرانی زبان کے شاذ الفاظ اور صیغوں کو سمجھنے کے لئے عربی زبان
سے مدد لیتے ہیں، کیونکہ عربی زبان لسانی حیثیت سے نسبتاً بہت قدیم ہے۔ عبرانی کے پیچیدہ
ور مبہم صیغوں کو اکثر یوں حل کیا جاتا ہے کہ وہ عربی الفاظ کی قدیم شکلیں ہیں، جو عربی میں
کثیر اور عامۃ الورود ہیں۔ یہودی روایات میں جن لفظوں اور محاوروں کا صحیح مفہوم غائب
ہو گیا تھا، وہ عربی کے وسیلہ سے آسانی اور یقین کے ساتھ حل ہو جاتے ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ
عہد نامہ عتیق کا کوئی سنجیدہ مطالعہ کرنے والا عربی کے براہ راست علم سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔
چنانچہ عہد نامہ عتیق کی جتنی شرحیں لکھی گئی ہیں، ان کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ اس مقدس
کتاب کی تفسیر عربی زبان کی کس قدر ممنون احسان ہے۔"[2]

عربی کے اثرات عبرانی ادب پر

عبرانیوں یا یہودیوں[3] کا عربی زبان کے ساتھ جو تعلق رہا ہے، وہ صرف اسی بات تک

---

[1] JULIUS WELLHAUSEN. MUHAMMED IN MEDINA, DAS IST VAKIDIS KITAB-AL-MAGHAZI IN DEUTSCHER WIEDERGABE, BERLIN, 1882.

[2] ALFRED GUILLAUME IN HIS PREFACE TO THE LEGACY OF ISLAM, P IX. OXFORD, 1931.

[3] عبرانیوں کی تاریخ حضرت ابراہیمؑ سے شروع ہوتی ہے۔ ان کے پوتے حضرت یعقوبؑ کا لقب*

(باقی اگلے صفحہ پر)